پھر یُوں ہوا

امجد اسلام امجد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امجد اسلام امجد

پھر یُوں ہوا

رابطہ کے لئے۔

جہانگیر بک ڈپو، 257 ریواز گارڈن لاہور

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔

ای میل : jbdsales@wol.net.pk

اشاعت : February 2003ء

سرورق : JBD آرٹ سیکشن، لاہور

لے آؤٹ : فواز نیاز

ڈیزائن : عمران احمد، پیسٹنگ: کمال احمد

قیمت : -/200 روپے

ناشر: عدیل نیاز، آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318
فیکس: 042-7213319 ای میل: jbdsales@wol.net.pk سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور
فون: 042-7220879 سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-7765086 سیلز ڈپو: اقبال روڈ
نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: 051-5539609 سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ
روڈ حیدر آباد۔ فون: 0303-6217098

نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔ فون: 042-7314319

انتساب

بیٹی تحسین ناصر

داماد ناصر منیف قریشی

کے لئے جو میری آنکھوں

کی روشنی ہیں

ترتیب

پھر یوں ہوا

"برزخ" "ساتواں در" "فشار" "ذرا پھر سے کہنا" "اُس پار" "اتنے خواب کہاں رکھوں گا" "بارش کی آواز" "سحر آثار" اور "ساحلوں کی ہوا" کے بعد یہ میرا دسواں مجموعۂ کلام ہے جو آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ یہ سفر **1974ء** سے **2002ء** تک کے اٹھائیس سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر اس میں "برزخ" کے مشمولہ کلام کا وقت بھی شامل کر لیا جائے تو **9** سال مزید جمع کر کے یہ ٹوٹل **37** برس بن جاتے ہیں۔ اس دوران میں نے ادب کی کئی اور اصناف میں بھی طبع آزمائی کی جس کے مٹتے بنتے رنگ باقی کی **31** کتابوں پہ بکھرے ہوئے ہیں۔

اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ؎

وہی نہیں تو ورق کس لئے سیاہ کریں
سخن تو عرضِ تمنا کا اک بہانہ تھا

یا

ہمیں کیا جو سخن دنیا میں گونجا
جسے سننا تھا وہ سنتا نہیں ہے!

کیوں کہ اگر میں ایسا کہوں گا تو یہ خلافِ واقعہ بھی ہو گا اور جھوٹ بھی کہ مندرجہ بالا دونوں شعر جب کہے گئے تو یہ اپنے

اندر سچ کا ایک پہلو رکھتے تھے مگر یہ پورا سچ نہیں ہے یا یوں کہنا چاہئیے کہ یہ ہر دور کا یعنی **universal** سچ نہیں ہے۔ اسے آپ ایک مضمون شعر یا ایک مخصوص لمحاتی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ شاعری میں ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو ایک وقت میں سچ اور دوسرے میں جھوٹ کا روپ دھار لیتی ہیں۔ زندگی کے تجربات اور محسوسات، جذبات اور خیالات کو ایک نیا رنگ دیتے ہیں اور یوں کئی ایسے رنگ بھی ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے **match** نہیں کرتے اور شاید یہی زندگی کا حسن ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کے خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ہجر کی جگہ وصل کا موسم لے لیتا ہے اور کبھی وصل کی رات کا ستارہ اول صبح کی دھند میں کھو جاتا ہے۔

"*پھر یوں ہوا*" بھی جہانگیر بک ڈپو کے زیر انتظام شائع ہو رہی ہے اور یوں اب میری ساری شاعری (مجموعۂ نظم "*میرے بھی ہیں کچھ خواب*" اور مجموعۂ غزل "*ہم اُس کے ہیں*" سمیت) جہانگیر بک ڈپو کی وساطت سے آپ تک پہنچ رہی ہے۔ اس کے مالکان تین نوجوان بھائی نبیل، فواز اور عدیل ہیں اور جس محنت اور خوش اسلوبی سے یہ شاعری کی کتابیں چھاپ رہے ہیں اس کی مثال معاصر ناشرین میں کم کم ملتی ہے۔

باتیں تو آپ سے کرنے کی بہت ہیں لیکن میرے خیال میں "شاعری" کو ہی بولنے دیا جائے کہ اس آواز میں میرے ساتھ ساتھ آپ بھی شامل ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ
N-275 ڈیفنس لاہور
۳ ستمبر ۲۰۰۲ء

نعت

جل اُٹھے ہیں نگاہوں میں کتنے دیئے اِک ترے نام سے
کِھل اُٹھے راستوں میں عجب پھول سے اِک ترے نام سے

کوئی خوشبو سی تھی لے اُڑی جو ہمیں راستہ راستہ
دیکھتے دیکھتے طے ہوئے مرحلے اِک ترے نام سے

درد تھا مستقل، بے ٹھکانہ تھا دل اور ہم پا بہ گِل
چین سا آگیا خواب روشن ہوئے اِک ترے نام سے

جتنے جالے تنے تھے مری رُوح پر سب دُھواں ہو گئے
دُور ہونے لگے سارے شکوے گِلے اِک ترے نام سے

گُنگُنانے لگی ہے مری رُوح بھی، تیری یاد آ گئی
جگمگانے لگے، میرے سب آئنے اِک ترے نام سے

نعت

تُمھارے شہر میں دیوانہ وار آئے ہیں
ہم آج ہو کے بہت بے قرار آئے ہیں

مرے حضورؐ، فقط ایک ہی نظر سے ہی
نظامِ عالمِ ہستی سنوار آئے ہیں

ہمیں بھی اُن کی وساطت سے کچُھ ملے مولا،
حرا کے بام سے جب کر پُکار آئے ہیں

خُدا کا آخری پیغام تھا اُنہی کے لیے
زمیں پہ یوں تو پیمبر ہزار آئے ہیں

خوشا وہ اُن کی حضوری، خوشا وہ اُن کی گلی
جو بوجھ تھا دِل و جاں پر اُتار آئے ہیں

اَبد تلک نہیں بدلے گا جس کا اَب موسم
چمن میں لے کے وہ ایسی بہار آئے ہیں

بس اک سخن وُہی شبنم کے آئنے جیسا
کہ جس سے آپ یہ گلشن نکھار آئے ہیں

عجب یقیں کا سمندر ہے موجزن امجدؔ
عجب گمان کے دریا کے پار آئے ہیں!

○

مری سوچیں بدلتی جا رہی ہیں
کہ یہ چیزیں بدلتی جا رہی ہیں!

تماشا ایک ہے روزِ ازل سے
فقط آنکھیں بدلتی جا رہی ہیں

بدلتے منظروں کے آئنے میں
تری یادیں بدلتی جا رہی ہیں

اگرچہ ہیں وُہی پھندے پُرانے
مگر گرہیں بدلتی جا رہی ہیں

دِلوں سے جوڑتی تھیں جو دِلوں کو
وہ سب رسمیں بدلتی جا رہی ہیں

اُدھوری، نامکمّل، خواہشیں کیوں
نئی شکلیں بدلتی جا رہی ہیں

اگر منزل وُہی ہے راہیوں کی
تو کیوں راہیں بدلتی جا رہی ہیں!

نجانے کیوں مجُھے لگتا ہے امجدؔ
کہ وہ نظریں، بدلتی جا رہی ہیں

جیون

جیون کھیل نہیں جاناں
آگ اور پانی، پھول اور شبنم، دھرتی اور اس نیل گگن کا
کوئی میل نہیں جاناں

جیون خواب نہیں جاناں
ہم کو بھی معلوم ہے لیکن اب اس غم کو سہہ جانے کی
دل میں تاب نہیں جاناں!

جیون روگ نہیں جاناں،
لیکن وہ جو مرہم بن کر ہر اک زخم سلا دیتے تھے
اب وہ لوگ نہیں جاناں!

جیون شام نہیں جاناں،
سُورج سے مجبُور ہو تم بھی شاید سمت بدل لینے پر
یہ الزام نہیں جاناں!

جیون آگ نہیں جاناں،
اپنی سُندرتا کی لَو میں اپنے آپ ہی جل جاتے ہیں
جن کے بھاگ نہیں جاناں!

جیون دُھول نہیں جاناں،
تیز ہوا کی آہٹ سُن کر شاخ سے اپنی کٹ جائے
یہ ایسا پھُول نہیں جاناں!

علی ذیشان کے لیے ایک نظم

مرے بیٹے نے آنکھیں اِک نئی دُنیا میں کھولی ہیں
اُسے وہ خواب کیسے دُوں
جنہیں تعبیر کرنے میں مری یہ عُمر گزری ہے!

مری تعظیم کی خاطر وہ اِن کو لے تو لے شاید
مگر جو زندگی اُس کو ملی ہے اُس کے دامن میں

ہمارے عہد کی قدریں تو کیا یادیں بھی کم کم ہیں
انوکھے بھُول ہیں اُس کے نرالے اُس کے موسم ہیں
خود اپنی موج کی مستی میں بہنا چاہتا ہے وہ!
نئی دُنیا ۔ نئے منظر میں رہنا چاہتا ہے وہ!

سمجھ میں کچھ نہیں آتا اُسے کیسے بتاؤں میں
زمیں پر آج تک جتنے بھی آدم زاد آئے ہیں
اِسی مُشکل سے گزُرے ہیں
اِنہی رستوں میں اُلجھے ہیں
اِسی منزل سے گزُرے ہیں!
اَزل سے آج تک جتنے محبّت کرنے والے ہیں
سبھی کی اِک کہانی ہے
نئی لگتی تو ہے لیکن حقیقت میں پُرانی ہے ۔

اُسے کیسے بتاؤں میں کہ میرے باپ کی باتیں
مجھے بھی ایک ایسے وقت کا احوال لگتی تھیں
جو اِک بھُولا فسانہ تھا
میں اُس کی جیب کے متروک سکّوں کو کہاں رکھتا

کہ یہ میرا زمانہ تھا!
نئے بازار تھے میرے، کرنسی اور تھی میری
وہ بستی اور تھی میری!

مگر پھر یہ کُھلا مجھ پر، نیا کچھ بھی نہیں شاید
اَزل سے ایک منظر ہے فقط آنکھیں بدلتی ہیں!
مری نظروں کا دھوکہ تھا کہ یہ چیزیں بدلتی ہیں!

اُسے کیسے بتاؤں میں!
کہ یہ عرفان کا لمحہ ابھی اُس تک نہیں پہنچا!
مگر جس وقت پہنچے گا
اُسے بھی اپنے بیٹے کو یہی قصہ سنانے میں
یہی دُشواریاں ہوں گی۔
کہ وہ بھی تو کچھ اپنی بات کہنا چاہتا ہوگا!
نئی دُنیا، نئے منظر میں رہنا چاہتا ہوگا!
بس اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہوگا!!

ماں

میں جدھر گیا، میں جہاں رہا
مرے ساتھ تھا،
وہی ایک سایۂ مہرباں،
وہ جو ایک پارۂ ابر تھا سرِ آسماں،
پسِ ہر گماں
وہ جو ایک حرفِ یقیں تھا

(مرے ہر سفر کا امین تھا)
وہ جو ایک باغِ ارم نما سبھی موسموں میں ہرا رہا
وہ اُجڑ گیا
وہ جو اِک دُعا کا چراغ سا مرے راستوں میں جلا رہا
وہ بکھر گیا

مرے غم کو جڑ سے اُکھاڑتا
وہ جو ایک لمس عزیز تھا
کسی کپکپاتے سے ہاتھ کا وہ نہیں رہا
وہ جو آنکھ رہتی تھی جاگتی مرے نام پر
وہی سوگئی !
وہ جو اِک دُعائے سکون تھی مرے رَخت میں
وہی کھوگئی۔

اے خُدائے واحد و لَم یزَل
ترے ایک حرف کے صید ہیں
یہ زماں مکاں !

ترے فیصلوں کے حضور میں
نہ مجال ہے کسی حرف کی نہ کسی کو تابِ سوال ہے
یہ جو زندگی کی متاع ہے
تری دَین ہے، ترا مال ہے
مُجھے ہے تو اِتنا ملال ہے!

کہ جب اُس کی ساعتِ آخری سرِ راہ تھی
میں وہاں نہ تھا!
مرے راستوں سے نکل گئی وہ جو ایک جائے پناہ تھی
میں وہاں نہ تھا!
سرِ شامِ غم مجھے ڈھونڈتی مری ماں کی بُجھتی نگاہ تھی
میں وہاں نہ تھا!
مرے چار سُو ہے دُھواں دُھواں
مرے خواب سے مری آنکھ تک
یہ جو سیلِ اشک ہے درمیاں
اِسی سیلِ اشک کے پار ہے
کہیں میری ماں!

ترے رحم کی نہیں حد کوئی !
ترے عفو کی نہیں اِنتہا
کہ تُو ماں سے بڑھ کے شفیق ہے
وہ رفیق ہے
کہ جو ساتھ ہو تو یہ زندگی کی مُسافتیں
یہ اذیّتیں ــــ یہ رکاوٹیں
فقط اِک نگاہ کی مار ہیں
یہ جو خار ہیں
ترے دستِ معجزہ ساز سے
گُلِ خوش جمالِ بہار ہیں ـ

مری اِلتجا ہے تو بس یہی
مری زندگی کا جو وقت ہے، کٹے اُس کی اُجلی دُعاؤں میں
ترے درگُزر کے حضور میں
تری برکتوں کے حصار میں !
وہ جو خاص چشمِ کرم میں ہے
اُسی روشنی کی قطار میں !!

کِسی چیز کی بھی کمی نہیں

تری بخششوں کے دیار میں!

مری ماں کی رُوحِ جمیل کو

سدا رکھنا اپنے جوار میں!!

سدا پُرفضا وہ لَحد رہے ترے لُطفِ خاص کی چھاؤں میں

زینہ زینہ اُترتا غم

دائرہ در دائرہ اس گردبادِ وقت کے رستے میں جو یہ
کچھ خس و خاشاک سے اُڑتے بکھرتے جا رہے ہیں
کون ہیں !
وَسوسوں اور خواہشوں کی بستیوں کے درمیاں جو
ایک سیلِ بے جہت کا رِزق بنتے جا رہے ہیں
کون ہیں !

جس میں شامل بھی نہیں تھے ایک ایسے بے ٹھکانہ
جُرم کا تاوان بھرتے جا رہے ہیں،
کون ہیں!
رات دن کیڑوں مکوڑوں کی طرح سے
یہ جو جیتے اور مرتے جا رہے ہیں
کون ہیں!
دل کی وحشت، اپنے ہی سائے کی دہشت
سے لرزتے جا رہے ہیں
کون ہیں!
ماتمِ اہلِ وفا میں بَین کرتے
جا رہے ہیں
کون ہیں!
یہ جو مِٹتے
جا رہے ہیں
کون ہیں!

———

وقت کے دریا میں آؤ

وقت کے دریا میں آؤ ایک دن
یُوں بہا دیں جا چکے لمحوں کی راکھ
جیسے ان سے کوئی بھی رشتہ نہ تھا !
جیسے ہم اس آگ سے گزرے نہ تھے !
آئینے، یادوں کے جھلمل منظروں کی اوٹ سے
ہم کو دیکھیں اور ششدر سے رہیں
"کیسے چہرے ہیں جو اپنے عکس سے ملتے نہیں !"
آتے جاتے موسموں کی آنکھ میں حیرت سی ہو ،
"کیسے غنچے ہیں جو فصلِ گُل میں بھی کھلتے نہیں !"
وقت کے صحرا میں آؤ ایک دن
یوں چُرا کر ڈوبتے تاروں سے آنکھ
اپنے اپنے راستوں کی گرد میں رُوپوش ہوں
جیسے ہم نے منزلوں کے خواب تک دیکھے نہ تھے !!

○

پھُول جو مہکیں ، سدا مہکا کریں
اب کے موسم آپ کچھُ ایسا کریں

دل کے دھندوں سے بھی فُرصت ہو چکی
اے غمِ دُنیا ، بتا ، اب کیا کریں!

جیسے کوئی دیکھتا ہو خواب سا
اِس طرح سے ہم تمھیں دیکھا کریں

ہے کوئی دیوار سی چاروں طرف
اُس کے دِل میں کِس طرح رَستا کریں

جب تلک باقی رہے مُنہ میں زباں
اپنے حق کے واسطے بولا کریں

کاٹتے رہتے ہیں اہلِ دزد کو
اور کیا خدمت سگِ دُنیا کریں

پاؤں میں رکھیں خم و پیچِ طلب
سر پہ یادِ یار کو خیمہ کریں

آنکھ کو ہو بس تمھاری جُستجو
بس تمھیں ڈھونڈیں، تمھیں دیکھا کریں

ق

آپ بے شک ہیں مسیحا وقت کے
اِس مریضِ غم کو تو اچھّا کریں!

آپ سے پہلے جو تھے عالم پنہ
اُن کے بارے میں بھی کچھ سوچا کریں!

کِس جہنّم میں ہے یہ خلقِ خُدا
شہر کی سڑکوں پہ بھی نِکلا کریں!

○

دلوں میں جب پڑی گرہیں، تو گھر نہیں تھا وہ
پلٹ کے آئے جو موسم شجر نہیں تھا وہ

بہت مزے سے جو اُس نے پلٹ پلٹ کے سُنی
سخن گری وہ نہیں تھی، ہُنر نہیں تھا وہ!

نہ وہ بہار سا لہجہ، نہ آشنا آنکھیں
شبِ وصال میں جو تھا، سحر نہیں تھا وہ

بس ایک پل کے لیے ہم رُکے تھے رستے میں
بدل گئے سبھی منظر، سفر نہیں تھا وہ

نہ کوئی نقشِ قدم تھا نہ رہنما تارا
دُعائے شام میں شاید اثر نہیں تھا وہ

عجیب بھول بھلیّاں تھا اُس کا ہونا بھی
ہر ایک شے میں وُہی تھا، مگر، نہیں تھا وہ

تمام رنگ، سبھی واسطے، اُسی کے ہیں
یہاں پہ کون تھا امجدؔ! اگر نہیں تھا وہ؟

حدّ

زمیں کی حد ہے
فلک کی کوئی بھی حد نہیں ہے !
ہم آپ ، اتنا ہی جانتے ہیں
اَبد کے پیچھے اَزل نہیں تھا
اَزل سے پہلے اَبد نہیں ہے

یہ وقت ایسا عجب سمندر ہے
لاکھ مہتاب آئیں جائیں
نہ جزر اس میں کہیں ہو پیدا
نہ اِس کے دامن میں مدّ کہیں ہے
کہ جو بھی لمحہ گزُر رہا ہے
وہ اپنے ہونے کی یا نہ ہونے کی
کشمکش میں گھِرا ہُوا ہے
یہ ایسا سیّال فیصلہ ہے
جو آپ اپنی سَنَد نہیں ہے
زمیں کی حد ہے
فلک کی کوئی بھی حد نہیں ہے ۔

چند غیر مربُوط منظر

چیڑ کے درختوں کی
بے لباس شاخوں پر
کُوکتی ہُوئی کوئل
تھک کے بیٹھ جائے گی

ایک گھر کے آنگن میں
تیسرے پہر کی دُھوپ
خامشی سے اُترے گی
اور بکھرتی جائے گی —

بارشوں کے موسم میں
آخری سٹیشن پر
اِک ٹرین ٹھہرے گی
اور لوٹ جائے گی

آندھیوں کی پس ماندہ
نیم وا دریچے میں
ایک بیل باقی ہے
یہ بھی ٹوٹ جائے گی!

○

مجھے خُود سے ہیں یہ شکایتیں، مجھے زندگی سے گلہ نہیں
کہ جو چاہا میں نے وہ پالیا، نہیں ایسا کُچھ جو ملا نہیں

مرے آس پاس ہے روشنی مرے راستوں میں چراغ ہیں
یہ ترے کرم کا ہے معجزہ، مری جستجو کا صلہ نہیں

تری آنکھ سے جو حسین ہو وہ نگاہ جگ میں بنی نہیں
ترے رُخ کو جس سے مثال دُوں کوئی ایسا پھُول کھلا نہیں

یہ جو تیری زُلف کا ہے حاشیہ، یہ جو تیرا چہرہ ہے خوش نُما
کوئی رات ایسی سیہ نہیں، کسی صبح میں یہ جلا نہیں

یہ جو مہر و مہ کی ہیں حالتیں! یہ جو آئنوں کی ہیں حیرتیں!
ہیں اَزل سے سب یہ اسی طرح، کوئی اپنی جا سے ہلا نہیں

اشتباہ

جو دِل کی آنکھ سے دیکھو تو یہ زمان و مکاں
کبھی رواں، کبھی ٹھہرے ہُوئے سے لگتے ہیں

یہ بے کنارئ صحرا یہ وُسعتِ افلاک
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے (میرے مُنہ میں خاک)
نہ ان کا اَنت ہے کوئی نہ نقطۂ آغاز!

یہ ایسے تیر ہیں جن کا نہیں ہے کوئی ہدف
کسی کمان سے چھُوٹے ہوئے سے لگتے ہیں

میں ان کو دیکھتا رہتا ہوں اِس توقع پر
نجانے کب یہ کسی سلسلے سے مل جائیں
وہ پھُول جو ہیں کسی ان بنے سے موسم میں
نجانے کون ہوا میں، کہاں پہ کھِل جائیں!

یہ مرے روز و شب و ماہ و سال کا قصہ
کسی زبان میں اُترے، کسی کتاب میں ہو!
کچھ ایسے پھُوٹتے بنتے ہیں بے طلب سے رنگ
کہ جیسے دیکھنے والے کی آنکھ خواب میں ہو!
نہیں کیا جو سفر، اُس کی گرد اُڑتی ہے
ردا تھکن کی یہ پہنے ہُوئے سے لگتے ہیں
یہ اجنبی سے زمانے، یہ نیم وا منظر!
کہیں یہ پہلے بھی دیکھے ہُوئے سے لگتے ہیں!!

اِس شہر کے باغوں میں وہ پھُول نہیں کھلتے

جو بات نہیں کرتے
اُن بولتے رنگوں میں
میں نے تمھیں سوچا ہے!
جو دل سے گزُرتے ہیں
اُن اجنبی رستوں میں
میں نے تمھیں دیکھا ہے!

کہنے کے لیے تم سے،
باتیں تو بہت سی ہیں
الفاظ نہیں ملتے!
جو میری نظر میں ہیں
اِس شہر کے باغوں میں
وہ پھول نہیں کھلتے!

میں نے تمھیں جانا ہے
اظہار کے رشتوں سے
اِس طرح جُدا ہو کے!
جس طرح کوئی بندہ
دھرتی پہ نظر ڈالے
اِک بار خدا ہو کے!

تم مجھے اچھّی لگتی ہو

تم مجھے اچھّی لگتی ہو
بس تم مجھے اچھّی لگتی ہو !
تم اِتنی سُندر ہو کہ نہیں!
تمھیں ایک نظر جو دیکھے وہ
سُدھ بُدھ بھُولے ، مدہوش رہے
بس تم مجھے اچھّی لگتی ہو۔

تم ہنس دو تو موسم بدلیں
تم جاگو تو دُنیا جاگے
جِھلمِل جِھلمِل منظر ہوں سب
اور نہ سُوجھے کچھ آگے
بس تم کو دیکھیں ، دیکھتے جائیں
معلوم نہیں تم اِتنی پیاری
اِتنی سُندر ہو کہ نہیں
بس تم مجھے اچھّی لگتی ہو۔

اَن سُنے لفظ

کسی ریگزار کی دُھوپ میں وہ جو قافلے تھے بہار کے
وہ جو اَن کھِلے سے گلاب تھے
وہ جو خواب تھے مری آنکھ میں
جو سحاب تھے تری آنکھ میں
وہ بکھر گئے، کہیں راستوں میں غبار کے!

وہ جو لفظ تھے دمِ واپسیں
مرے ہونٹ پر
ترے ہونٹ پر
اُنھیں کوئی بھی نہیں سُن سکا
وہ جو رنگ تھے سرِ شاخِ جاں
ترے نام کے
مرے نام کے
اُنھیں کوئی بھی نہیں چُن سکا۔

○

رُت پلٹتی نہیں ، وقت رُکتا نہیں
زور اپنا مقدّر پہ چلتا نہیں

دِل کے دریا کے اپنے ہی قانون ہیں
چاندنی سے یہ چڑھتا اُترتا نہیں

دید سے آنکھ کی پیاس بُجھتی نہیں
دھوپ سے جس طرح پیٹ بھرتا نہیں

ریت کے ڈھیر سے کھیلتی ہے ہَوا
کوئی نقشِ قدم ساتھ چلتا نہیں

کتنی صدیوں کا ملبہ پڑا ہے یہاں
یہ شکستہ مکاں پھر بھی گرتا نہیں

جینے والوں کا ماتم ہے چاروں طرف
جانے والوں کو اب کوئی روتا نہیں

ہائے عشّاق کی سہل انگاریاں
عشق میں کوئی جاں سے گزُرتا نہیں

ہے یہ امجدؔ ازل سے زمیں کا چلن
پھُول کھلنے کا موسم ٹھہرتا نہیں

○

نہیں کہ اپنی تمنّا پہ اعتبار نہیں !
مگر یہ دِل کہ اِسے تاب انتظار نہیں

نگاہ کر کہ مری زندگی سنور جائے
شتاب آ کہ مری جان کو قرار نہیں

عجب نشہ ہے شبِ وصل کا کہ جان مری،
یہ عُمر بھر کی جُدائی بھی دل پہ بار نہیں

بس ایک خاک سی اُڑتی ہے جس طرف دیکھیں
نشانِ بہار کا کوئی پسِ بہار نہیں

یہ ایک رُوپ ہے اُس بے نیاز مالک کا
کسی کو وقت کی گردش پہ اختیار نہیں

یہ میرا دل ، یہ تری آرزو کا آئینہ
اِک ایسا دشت ہے جس میں کوئی غبار نہیں

عجب اُصول ہیں اس محفلِ زمانہ کے
کہ ہوشیار وُہی ہے جو ہوشیار نہیں

جو دل کی آنکھ سے دیکھو تو یہ زمان و مکاں
بس ایک لمحے کا میلہ ہیں بے کنار نہیں!

اُٹھائے پھرتا ہوں اِس دشتِ بے کنار میں میں
اِک ایسا غم کہ جو مجھ پر بھی آشکار نہیں

یہ کیسا عشق ہے امجد کہ دل میں رہتا ہے
یہ کیسا درد ہے جس کا کوئی شمار نہیں

○

جذبوں کا احترام مری جان تم کرو
ہم سے بھی کچھ کلام مری جان تم کرو

آئے جواب کے وصل کی شب اُس کو روک لو
اِتنا سا ایک کام، مری جان تم کرو

رہتی ہیں یہ جو آنکھیں مری اتنی مُضطرب
ان وحشیوں کو رام، مری جان تم کرو

منزل خود آپ چل کے مرے راستے میں آئے
آنکھوں سے گر سلام، مری جان تم کرو

یہ جو سُپردگی کی ادا ہے دبی دبی
اس کو ہمارے نام، مری جان تم کرو!

○

میں ہُوں منسلک کئی سال سے
کسی آستانِ جمال سے

مری رُوح پھُول سی ہوگئی
تری دوستی کے خیال سے

تری بے وفائی کا شکریہ
مری جان چھوٹی وبال سے

گئی عُمر، پر نہ گزر سکے
ترے ہجر، تیرے وصال سے

ترے عشق نے مجھے جو دیا!
وہ ہے منکشف مرے حال سے

دیکھ اُلجھنیں نہ بڑھا مری
مجھے کچھ بتا تو مثال سے

یوں لگا کہ تھا مرا خواب وہ
کوئی پھُول ٹوٹا جو ڈال سے

○

کس کو یاد کرتی ہے ، بولتی ہوئی چڑیا
کھڑکیوں سے لڑتی ہے، ڈولتی ہوئی چڑیا

آنے والے موسم کی سرخوشی میں دیوانی
منتظر پَروں کو پھر تولتی ہوئی چڑیا

یاد پچھلے موسم کی، پھر سجا کے آنکھوں میں
دَر کئی اِرادوں کے ، کھولتی ہوئی چڑیا

مژدۂ صبا لے کر پھر چمن میں آئی ہے
رس ہمارے کانوں میں، گھولتی ہوئی چڑیا

روشنی سی کرتی ہے، اپنے آنے جانے سے
بے چراغ شاموں میں، بولتی ہوئی چڑیا

شام ڈھلنے والی ہے، پھر ادھر سے گزرے گی
درد کے گہر کتنے، رولتی ہوئی چڑیا

مسکراتی بیلوں کو تھپتھپا کے گزری ہے
موسموں کی گرہوں کو، کھولتی ہوئی چڑیا

نُورجہاں

سمٹ گیا سُر دھارا
آوازوں کے میلے جیسی اِس دُنیا کے
مَوجیں مارتے دریاؤں میں
اپنے فن کی چمک دِکھا کر
پَلٹ گیا سُر دھارا

نغمے اُس کی تان میں ڈھل کر کیا کیا لہریں لیتے تھے !
سُر کی شمعیں جل اُٹھتیں تو منظر خوشبو دیتے تھے
وہ گاتی، تو رُوح کے اندر پھول سے جیسے کِھل جاتے تھے
قوسِ قزح کے رنگ تھے جتنے اُس کے سُر میں مِل جاتے تھے

وہ اِک ایسا خواب تھی جس کو
دیکھنے والی، آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں
اُس کی صدا کی جِھلملتا ہیں
رُوحیں سُدھ بُدھ کھو جاتی تھیں

ساٹھ برس تک جس نے کی تھی رنگوں میں پرواز
آج اچانک ٹوٹ گئی ہے
کانوں میں رَس گھولنے والی وہ تیتَل آواز !!

دُعا

خُدا نہ کردہ، تمھاری آنکھیں وہ رات دیکھیں
جو ہم نے دیکھی !
ہمارے قدموں نے جن دیاروں کی خاک چھانی
تمُھارے پاؤں بھی اُن سے گزُریں !
جو وقت کٹتا نہیں ہے ہم سے
تمھیں بھی اُس سے معاملہ ہو !
صَدا بھی اِک دُوسرے تک اپنی
پہنچ نہ پائے ، وہ فاصلہ ہو !

ایک بچگانہ خواہش

مری آنکھوں کے پردے پر وہ منظر بھی اُبھرتے ہیں
جو اَب تک بَن نہیں پائے
میں سُنتا ہوں وہ جُملے بھی، جو لفظوں میں نہیں اُترے!
میں چُنتا ہوں وہ خُوشبو بھی، جو غنچوں میں نہیں جاگی!
میں بُنتا ہوں وہ جالے بھی
جو رُوحوں میں لٹکتے ہیں کہیں باہر نہیں ہوتے
جو میرے دِل میں بَنتے ہیں مگر ظاہر نہیں ہوتے!

جو باتیں ہیں مرے دل میں
مرے کانوں میں، کہہ دو نا!
تمھارا ہی بسیرا ہے،
مری آنکھوں میں، کہہ دو نا!!

○

بستی کے منظر خاموش
گلیاں، بام اور دَر خاموش

جانے کس اندیشے میں !
رہتے ہیں یہ گھر خاموش

منزل کی آوازیں، چُپ
رستوں کے پتّھر خاموش

کیسی قاتل تنہائی ہے
اندر چُپ ، باہر خاموش

چین چُرا کر آنکھوں کا
رہتا ہے دِلبر خاموش

اندر کیا کیا ہنگامے ہیں !
دیکھو تو ساگر خاموش

کِس کی دُھن میں امجدؔ جی
رہتے ہو اکثر خاموش !

زُوم اِن٭

ایک اکیلی رات کے مَن میں کھلتے برف کے پھُول
کہرے کے ملبوس میں لپٹے کچھ تنہا سے پَل
چاند کی دھیمی لَو میں دَم دَم جلتی بجھتی راہ
سُونے گھر کے گیٹ پہ لیٹی کالی سَرد سڑک
کھڑکی کے سینے سے لپٹی اِک آوارہ بیل

اِک انجانے خوف سے سمٹی ششدر سی دہلیز

اپنی اپنی جگہ پہ حیراں، کمرے کی ہر چیز!

کونے کی اِک میز پہ جلتی، تھکی تھکی قندیل

کُرسی پر، سر پیچھے کر کے،

دروازے کی جانب تکتی اُلجھی سی دو آنکھیں

چھوٹی میز پر ٹھنڈا ہوتا کافی کا اِک کپ،

گھبرا کرتی وحشی سوچیں، جاگتے خواب اور میں!

گود میں کب سے پڑی ہوئی وہ ایک کتاب اور میں!!

٭ ایک تکنیک جس میں کیمرہ منظر کی تفصیلات کو دکھاتے ہوئے آہستہ آہستہ کسی خاص نقطے کے کلوز پر آتا ہے۔

○

جس گھڑی جلوہ فرما تُو ہوگا
ایک ہنگامہ کُو بہ کُو ہوگا

دیکھ کر تجھ کو اپنے دامن میں
کتنا حیران آبِ جُو ہوگا

جانے کب آئے گا زمینوں پر
وہ اُجالا کہ چار سُو ہوگا

پھُول کھلنے لگیں گے حرفوں میں
وہ جو موضوعِ گفتگو ہو گا

تھم سا جائے گا بہتا پانی بھی
آئنہ اُس کے رُو برو ہو گا

نقش ہے گر جہان کی ہر چیز
کوئی تجھ سا بھی ہُو بہُو ہو گا!

ڈُوبتے چاند کے سمے امجدؔ
جو بھی ہو گا وہ قبلہ رُو ہو گا

○

کب تک اَلم کی شام ہیں غم کے غبار میں
بیٹھے رہیں گے سایۂ دیوارِ یار میں

کچھ رنگ وہ ہیں جو نہیں بنتے کسی طرح
کچھ پھول وہ ہیں جو نہیں کھلتے بہار میں

تارے ہمارے بخت کے اے شامِ غم بتا
کب تک رہیں گے گردشِ لیل و نہار میں

بجھتے نہیں ہیں تیز ہواؤں سے جو چراغ
ہم نے وہ رکھ دیے ہیں رہِ انتظار میں

ہے اب تو بس یہ دیکھنا اغیار کا بھرم!
کب تک رہے گا تیری نگہِ اعتبار میں

ایسی ہو کوئی تان کہ لے جائے جان بھی
بس ایک رقصِ بے خُود و دیوانہ وار میں

پھر ایک شام یُوں ہُوا

پھر ایک شام یُوں ہُوا
ہَوا اُڑا کے لے گئی
وہ عافیت کی چادریں
وہ دِلبری کے لفظ جو
چمک رہے تھے چار سُو
وہ روشنی سے حرف جو
دمک رہے تھے سُو بسُو

جو عکس تھے جو نقش تھے
نگل گئی زمیں انھیں
کہ آسمان کھا گیا
پھر ایک شام یُوں ہُوا —

اے زمیں

یہ جو اقدار ہیں
یہ ہماری تمھاری جو اقدار ہیں
وقت کے کوڑے دانوں میں پھینکے گئے
کھوٹے سکّوں کی مبہم سی جھنکار ہیں
(اور کچھ بھی نہیں)

یہ جو معیار ہیں

یہ ہمارے تمہارے جو معیار ہیں
شب و روز کی اس کسوٹی پہ تُلنے کو لائے گئے
تو کُھلا یہ کہ یہ
بس ہمارے خیالوں کا اور خواہشوں کا
لگایا ہُوا ایک انبار ہیں
(جن کی قیمت صِفر سے زیادہ نہیں)

یہ جو کردار ہیں

یہ ہمارے تمہارے جو کردار ہیں
روشنی تیرگی، جھُوٹ سچ کی کشاکش میں اُلجھے ہوئے
اِس ڈرامے کے جتنے بھی کردار ہیں
سب ہمارے ہی چہروں کے بنتے بگڑتے ہُوئے نقش ہیں
جو کہ اسٹیج پر
فقط اپنی چہرہ نمائی کی خاطر
ہر اِک رُول کرنے کو تیار ہیں
یہ وہ مرتے ہوئے چند کردار ہیں
(جن کا کھیل اب کہیں پہ بھی جمتا نہیں)

یہ جو اسرار ہیں

یہ جو آنکھوں کے اور منظروں کے میاں
جھلملاتے ہُوئے لاکھوں اسرار ہیں
نیلے امبر کی چھت پر کھلے، اَدھ کھلے
جس قدر بھی ستارے نمودار ہیں
اپنے اندر کی اُلجھن میں اُلجھے ہُوئے
یہ جو باہر کی دُنیا کے آزار ہیں
(کتنے بے درد ہیں مرگ آثار ہیں)

(۲)

آگہی کی بکھرتی ہُوئی دُھند کی
ایک دیوار سی
ہر طرف ہے تنی
اور باہر نکلنے کا رستہ نہیں
کوئی باہر نکلنے کا رستہ نہیں
جیسے جادُو میں ہم سب گرفتار ہیں
در پہ زنجیر ہے
کھڑکیوں اور دریچوں میں تالے پڑے ہیں

چھتوں کی طرف کوئی زینہ نہیں !!
لاکھ سُورج فلک پر ہویدا ہوئے
چاند نکلے کئی
اِک کرن بھی مگر ہاتھ آئی نہیں
نسلِ نَو ہیں جن کی آندھی میں قائم رہیں
اَب فقط وہ دیئے ہم کو درکار ہیں
ہم ہیں کیا اور ہماری حقیقت ہے کیا
اس سے قطعِ نظر
یہ زمیں آسماں اور یہ عصرِ رواں
اپنی دُھن میں مگن محوِ رفتار ہیں
ہاتھ میں کچُھ ارادوں کے پُرزے لیے
اپنے اپنے ضمیروں کے قیدی بنے
راستوں میں کھڑے
ہر مسافت کے رستے کی دیوار ہیں —

اپنی اقدار کے — اپنے کردار کے
جتنے بھی عکس ہیں

آئنے اُن کی صُورت سے بیزار ہیں
اے زمیں، ہم نے تیری حفاظت نہ کی
ہم گُنہگار ہیں — ہم گُنہگار ہیں —

سب تمھارے لیے

سب تمھارے لیے
جانِ جاں یہ جہاں ، یہ زمیں آسماں
یہ مرے رات دن ، خاک ہیں تیرے بن
یہ مری زندگی ، دوستی دشمنی
راستے ، واسطے ، سب تمھارے لیے
سب تمھارے لیے

تم جو دیکھو تو میرے شب و روز کو
کوئی مطلب ملے
تم جو پوچھو تو میرے ہر اِک حرف کو
کوئی رُتبہ ملے، کوئی منصب ملے

تم جو سوچو مرے واسطے کچھ کبھی
میں ستاروں کو مُٹھی میں بھر لاؤں گا
تم اگر ایک دن مجھ کو آواز دو
میں جہاں پر بھی ہوں، لَوٹ کر آؤں گا
یہ مرے جسم و جاں میرے شعر و سخن
میری تنہائیاں
بزم آرائیاں
اب تمھارے لیے
سب تمھارے لیے ـــ

ـــــــــ

○

نہ بھادوں ہے نہ اب ساون ہمارا
کسی کی یاد ہے مَسکن ہمارا

ہر اک رَستے میں سائے دیکھتا ہے
ہمارا ذہن ہے دُشمن ہمارا

تمُھارے سنگ ہیں اَب رنگ سارے
نہ موسم ہے نہ اب گلشن ہمارا

جُدائی ہی اگر تقدیر ٹھہری
چلو تم شہر لے لو، بَن ہمارا

کبھی گزُرو تو پَل بھر کو ٹھہرنا
سرِ رہ ہے تو ہے مدفن ہمارا

ہم اِس کوُچے سے کیا نکلے کہ امجد
نہیں لگتا کہیں بھی من ہمارا

مُلاقات

زمیں کی کہانی ہے اُتنی پرانی
کہ جتنا پُرانا ، ہے سب کارخانہ ، یہ دن رات کا

فلک کا یہ قصّہ بھی حصّہ ہے میری
تمھاری اَزل سے ادھوری سی اک بے رُخی بات کا

یہ زمیں اور اس کے یہ سب خُوبصورت
مناظر ہیں شاہد
کہ تم نے مرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر
کہا تھا کہ آؤ یہ سنسار دیکھیں

یہ سنسار جو اُس
نے مرکز بنایا تمھاری مری اِس ملاقات کا !!

سمے کی صدا

ظُلم وہ آگ ہے
بے بسی کی ہَوا جس کو کاندھوں
پہ لے کر نکلتی ہے تو
رُوح سے لے کے منظر کے پھیلاؤ تک
اس کے شعلے لپکتے ہیں چاروں طرف
صف بہ صف یہ سپہ مار کرتی ہُوئی
وار کرتی ہُوئی

اپنے رستے میں آئی ہر اک چیز کو
ایک شعلہ بناتی چلی جائے گی
ہر دُعا، التجا، راکھ کرتی ہُوئی
ہر عمارت کو کھاتی چلی جائے گی۔

ظُلم کی آگ کو روکنا ہے اگر
جان ہاتھوں پہ رکھ کر چلو دوستو
بے بسی رِزق ہے ظلم کی آگ کا
رزق یہ اس کو ہرگز نہ دو دوستو
ظُلم کے سامنے سر اُٹھانے میں ہی
ظُلم کی موت ہے
یہ سمے کی صدا ہے، سُنو دوستو!

جنگل مُجھ سے بات تو کر

جنگل مُجھ سے بات تو کر
دیکھ، کہاں سے آیا ہُوں!
سنّاٹا ہے چاروں جانب اور ہَوا کی سرگوشی میں
ٹُوٹے ٹُوٹے سے کچُھ جُملے
رات گئے تک ہونے والی بارش کے قطروں کی صُورت
پتّہ پتّہ ٹپک رہے ہیں۔

تین برس اور سولہ دن پہلے کی گزری شام کوئی
یہیں کہیں پر رُکی ہوئی ہے
اور اِک گہرے سایوں والے پیڑ پہ اب بھی
ہم دونوں کے نام کھدے ہیں
[اور اِک دل ہے جس میں کوئی تیر ترازو تب سے ہے]

جنگل، تیرے سامنے اُس دن ہم نے کتنی باتیں کی تھیں
تجھ کو بھی وہ یاد تو ہوں گی !
سب نہ سہی پر تھوڑی تھوڑی،
یہ جو ہوا کی سرگوشی ہے اس کے ٹوٹے جملوں جیسی
ابھی ابھی اس تھمنے والی بارش کے ان قطروں جیسی
تین برس اور سولہ دن کا اِک اِک لمحہ لایا ہوں
جنگل، مجھ سے بات تو کر دیکھ کہاں سے آیا ہوں!

اَب ظُلم نہیں سہنا

ہیں لوگ دُکھی کتنے
اے راج محل والو

اِن سُکھ سے بھری شاموں
خُوشبُو سے لَدے لمحوں
رنگین حسیں صحبت
اور لُطف کی جنّت سے
نِکلو تو کبھی دیکھو
اے راج محل والو
ہیں لوگ دُکھی کتنے

اِن سارے دُکھوں کا تُم
خود آپ ہی کارن ہو
خود آپ مداوا بھی

یہ بوجھ بڑھا دے گا
گزرے گا جو لمحہ بھی
یہ خاک نشیں خلقت سر جب بھی اُٹھائے گی
یہ محل، یہ چوبارے، ان سب کو گرا دے گی
اے عرش نشیں لوگو
موسم کو ذرا دیکھو
ارمان جو پلتے ہیں جمہور کے سینے میں
طوفان جو برپا ہیں لمحوں کے سفینے میں
امکان جو زندہ ہیں خوابوں کے دفینے میں
ہے سب کا یہی کہنا
تنکوں کی طرح اَب تو دریا میں نہیں بہنا
اُمید کے سُورج کو اَب اور نہیں گہنا
خاموش نہیں جینا، محکوم نہیں رہنا
اَب ظلم نہیں سہنا
اَب ظلم نہیں سہنا

سمندر کو دیکھو

سمندر کو دیکھو
یہ کیسی خشونت سے ساحل پہ بکھری ہُوئی ریت
سے بات کرتا ہے، کیسے
ہمارے بنائے ہُوئے ریت گھر توڑتا ہے۔
ہمیں یہ بتاتا ہے اس کی نظر میں
ہمارے گھروندے ہوں یا شیشۂ دل
کسی کے لیے بھی رعایت نہیں ہے

وہ بس اپنی طاقت کے نشّے میں رہتا ہے
اور اپنی دہشت کے بے سمت سائے
کراں تا کراں تاننا چاہتا ہے

اُسے یہ پتہ ہے
یہ خشکی کے ٹکڑے جو اس کی فنا رنگ لہروں
کے رستے میں بکھرے ہُوئے ہیں
سب اس کے خمِ چشم کے اِک اشارے پہ ٹھہرے ہیں
اس کے ستم سے پنہ مانگتے ہیں۔

کہے کون اس کو کہ اے اپنی مستی میں بپھرے سمندر
نہ بڑھ حد سے آگے،
تکبّر ہے زیبا فقط اُس خُدا کو
جو سارے جہاں کا، زمیں آسماں کا
زمان و مکاں اور یقین و گماں کا
اَزل سے ہے مالک اَبد تک رہے گا
اور اُس کی مشیّت کے آگے سمندر

تکبّر میں ڈوبا ہُوا ہر سمندر
جو دیکھو تو چھوٹی سی اک آبجُو ہے

کہے کون اس سے کہ یہ کارخانہ
گزُرتا زمانہ
نگاہوں کا دھوکہ ہے مِٹتے مناظر کی بازی گری ہے
کہ جس سمت جائیں فنا رُوبرو ہے،
خُدا کی بنائی ہُوئی اس زمیں پر
ہر اک شے ہے فانی نہ میں ہُوں نہ تُو ہے۔

موسم اچھّا ہے

رنگ دھنک نے بکھرائے ہیں موسم اچھّا ہے
گئے زمانے یاد آئے ہیں موسم اچھّا ہے

آنکھیں، چہرے، خوشبُو، وعدے، آنسو، یادیں، پُھول
ایک اِک کرکے لَوٹ آئے ہیں موسم اچھّا ہے

شامِ شفق کی سَیر بہانے تم بھی آجاؤ
دوست پُرانے سب آئے ہیں موسم اچھّا ہے

گیارہ ستمبر

گیارہ ستمبر کی اک عام سی بے ڈھکانہ سحر کو
کسے یہ پتہ تھا
ابھی چند لمحوں میں کچھ ایسا ہو گا
کہ دُنیا کی صُورت بدل جائے گی
وہ جس کی حکومت کی دہشت سے سارا جہاں کانپتا ہے
نشاں اس کی عظمت کے بکھریں گے ایسے
کہ آنکھیں رہیں گی کھُلی کی کھُلی اور
مقدّر عجب چال چل جائے گا

وہ اس سانحے کے پسِ پشت ہاتھوں کی
پہچان کرنے میں سارے جہاں پر نظر ڈالتا ہے
اُسامہ کی گردن میں ڈالی ہے اُس نے جو الزام رسّی
وہ اس میں خود اپنے بنائے ہُوئے اُن
ثبوتوں کی گرہیں لگاتا چلا جا رہا ہے
کہ جن میں حقیقت کہیں بھی نہیں ہے -

کہا ہے سیانوں نے ،
ہر شے کے اندر سے اس کی نفی کا
عمل پُھوٹتا ہے
سو اب یہ جو ردِ عمل کا اشارہ ہے
اس کو سمجھنا ہی دانشوری ہے

بموں کے دھماکوں سے اور اپنی طاقت کی ننگی نمائش سے
سہمے ہُوئے کوہ و صحرا پہ وہ جس
قیامت کی بارش کیے جا رہا ہے
وہ اُس کے مقابل ہیں گرد و سرِ رہ سے بھی ہیچ تر ہیں

سو اَب یہ ہی احسن ہے
وہ رُک کے دیکھے کہ اُلجھن کہاں ہے !
گیارہ ستمبر کو جو پیش آیا
بظاہر وہ سب ایک رازِ نہاں ہے
دُھند لکے میں اُلجھی ہُوئی داستاں ہے
مگر غور کرنے سے یہ بھی کھُلے گا
کہ ایسی تباہی کی گھمبیر سازش
اُسامہ کے بس میں نہ تھی اور نہ ہو گی ۔

کہے کون اُس سے کہ اُس کا اُسامہ
اُسی کی حفاظت میں بیٹھا ہُوا ہے ۔

گِرتی ہُوئی دیوار

تُمھارے جبر کا حلقہ بہت مضبوط ہے لیکن

ہمارے صبر کی طاقت بھی اپنا اور ہی انداز رکھتی ہے

تُمھارے ظُلم کی حد سے بہت آگے کہیں پر ہے

ہمارے ضبط کی سرحد،

ہمارے ضبط کی سرحد

تُمھاری آنکھ میں جو ہے ہمارے خبط کی سرحد

ہمیں پکّا یقیں ہے اس زمیں پر آنے والا ہے
وہ خُوشبو سے بھرا موسم
جو ہر ظالم کے دستِ ظلم کے پُرزے اُڑا دے گا
جو صدیوں سے اندھیروں میں پڑے چہرے اُجالے گا
پُرانی ہے بہت یہ داستاں جبرِ مُسلسل کی !

مرے آبا نے بھی اس کے بُہت سے باب دیکھے ہیں
مرے پُرکھوں نے بھی ایسے بہت سے خواب دیکھے ہیں
کہ زنجیریں پگھلتی ہیں
گلے کے آہنی طوقوں کی بندش نرم پڑتی ہے
تو آوازیں سنورتی ہیں
صدائیں، جن کو سُن کر یُوں درِ زندان کھُلتے ہیں
کہ جیسے پھُول کھلتے ہیں
بشارت ہو کہ اب خُوشبو
ہمارے شہر کی گلیوں میں آزادانہ پھرتی ہے
مبارک ہو قفس والو
کہ اَب دیوار گرتی ہے ۔

○

یوں ہی تاریک ہے فردا ابھی موسم نہیں بدلا
چمن کا زرد ہے چہرا ابھی موسم نہیں بدلا

اُفق کے پاس جو اُڑتے ہیں سارے رنگ جھُوٹے ہیں
نہیں تم سے کوئی پردا، ابھی موسم نہیں بدلا

قفس میں خیر سے موسم ہمیشہ کم بدلتے ہیں
قفس کے پار بھی دیکھا، ابھی موسم نہیں بدلا

چمن والو یہ کیسی پھول رُت آئی گُلستاں میں
ہے رُوئے گُل پہ یہ لکھا، ابھی موسم نہیں بدلا

خزاں کی شام گُلشن میں منادی کرتی جاتی ہے
ابھی موسم نہیں بدلا، ابھی موسم نہیں بدلا

لبِ دریا جلے خیمے وُہی قصّہ سُناتے ہیں
ہے دریا آج بھی پیاسا، ابھی موسم نہیں بدلا

کہو اہلِ چمن کوئی کہانی اپنی دُنیا کی،
یہاں پر ہے وہی نقشا، ابھی موسم نہیں بدلا

فضا میں جال پھیلے ہیں، نہیں جائے امانِ امجد
کہ ہے صیّاد کا پہرا، ابھی موسم نہیں بدلا

○

درِ کائنات جو وا کرے اُسی آگہی کی تلاش ہے
مجھے روشنی کی تلاش تھی مجھے روشنی کی تلاش ہے

غمِ زندگی کے فشار میں، تری آرزو کے غبار میں
اسی بے حسی کے حصار میں مجھے زندگی کی تلاش ہے

یہ جو سرسری سی نشاط ہے یہ تو چند لمحوں کی بات ہے
مری رُوح تک جو اُتر سکے مجھے اُس خوشی کی تلاش ہے

یہ جو آگ سی ہے دبی دبی، نہیں دوستو مرے کام کی
وہ جو ایک آن میں پھُونک دے اُسی شعلگی کی تلاش ہے

یہ جو ساختہ سے ہیں قہقہے مرے دل کو لگتے ہیں بوجھ سے
وہ جو اپنے آپ میں مست ہو مجھے اُسی ہنسی کی تلاش ہے

یہ جو میل جول کی بات ہے یہ جو مجلسی سی حیات ہے
مجھے اس سے کوئی غرض نہیں مجھے دوستی کی تلاش ہے

○

آگہی کے گمان میں کچھ ہے
عشق کے امتحان میں کچھ ہے

ہے شفق شام کی کہ خوں میرا
رنگ اِس داستاں میں کچھ ہے

نہیں لگتا یہ دِل تمھارے بِن
"آنکھ میں کچھ ہے دھیان میں کچھ ہے"

تیری یادیں ہیں یا کوئی آسیب
دل کے خالی مکان میں کچھ ہے!

جیسے دریا کے دو کنارے ہوں
واسطہ درمیان میں کچھ ہے

آنکھ کے ساتھ ہے جواں منظر
جان ہے تو جہان میں کچھ ہے

ہاں مری جان برملا کہیئے
گر دلِ مہربان میں کچھ ہے

داغ ہے یا چراغ ہے امجدؔ
اس دلِ بے زبان میں کچھ ہے

○

بولے تاروں کی جھلمل
رستہ تکتی ہے منزل

جیسے اشک سے خالی آنکھ
جیسے درد سے بوجھل دل

اک دریا کے تین کنارے
ماضی حال اور مستقبل

ہم تو تھک کر ہار گئے
غم ہے یا پتھّر کی سل

یاد کے شعلے اور بھڑک
درد کے غنچے اور بھی کھل

چھوڑ کے مٹّی پاؤں کی
اپنے قدموں سے مت چل

محبّت کی کہانی

محبّت کی کہانی میں بڑی دُشوار گھاتیں ہیں !
محبّت امن کی ساتھی
محبّت چین کی دُشمن
یہ اِک دستہ ہے پھُولوں کا
یہ ہے کانٹوں بھرا دامن
عجب کردار ہیں اس کے انوکھی ان کی باتیں ہیں
یہ ہے اِک آگ کا پیکر
یہی شبنم کا قطرہ بھی
یہ ہے اِک حبس کا عالم
یہی خُوشبُو کا رستہ بھی !
اندھیری ہے سحر اس کی، چمکتی اس کی راتیں ہیں
محبّت کی کہانی میں بڑی دُشوار باتیں ہیں۔

ارضِ وطن کی ان پہ جو گلیاں ہوئی ہیں تنگ
اپنے گھروں میں بند وہ چپ چاپ جل گئے
اُتری ہے اِن پہ موت کسی رات کی طرح

بُو چھوڑنے لگی ہے گلی میں پڑی وہ لاش
مدّت سے دل میں رکھی ہُوئی بات کی طرح

○

نذرِ ولی دکنی

شعر کا رُوپ پہن حلقۂ وجدان میں آ
اے مرے حسنِ گریزاں، کسی پہچان میں آ

ایک لمحے میں ہُوئے سارے زمانے روشن
"آتشِ عشق پڑی حُسن کے سامان میں آ"

نہیں غمّازِ غمِ جاں مرے ساحل کا سکوت
مُجھ سے ملنا ہے تو چل رُوح کے طوفان میں آ

اپنی پہچان کرانے کے لیے حُسنِ ازل
جلوہ انداز ہُوا صُورتِ اِنسان میں آ

ہیں ترے حُسن کا پھیلاؤ ذرا دیکھ تو تُوں
ایک لمحے کو سہی حلقۂ امکان میں آ

زندگی صرف تمنّا سے نہیں کٹ سکتی
فائدہ دیکھنے والے کبھی نقصان میں آ

ہماری دُنیا

آتے ہیں اَب نظر

صحرا میں دُور دُور تک خیمے جلے ہُوئے
اِک بے حسی کی دُھند کے جالے تنے ہُوئے

ہوتی ہے اَب تو چوک میں نیلام آبرو
لپٹے ہُوئے ہیں گرد میں خوابوں کے کاخ و کُو

ہر سمت آئنوں پہ ہیں رُسوائیوں کے داغ
فصلِ خزاں کا رِزق ہُوئے آرزو کے باغ

پھرتے ہیں ہم جہاں میں تماشا بنے ہُوئے
اِک بے وقار قوم کا چہرا لیے ہُوئے

یاں تک کہ اپنے قتل پہ روتا نہیں کوئی
ماتم میں بھی شریک اَب ہوتا نہیں کوئی

ہم

دُنیا پہنچ گئی ہے کہاں سے کہاں مگر
ہم بیٹھے پھیرتے ہیں یُونہی اپنی اُنگلیاں
ماضی کے کچُھ جلے ہُوئے لمحوں کی راکھ پر

چاروں طرف ہے بے عمل خوابوں کی سرد دُھند
وہ بے حسی ہے جس کی کوئی اِنتہا نہیں

اِس راکھ میں شرر کوئی زندہ ہو، دیکھنا!
سنتا کوئی ہو بات مری گر، تو دیکھنا!

○

ہونے لگی ہے خود سے جو وحشت تو کیا ہوا!
گھاٹے کا ہے یہ کارِ محبت تو کیا ہوا!

تھاما قلم تھا جس کے لیے وہ ہے بے خبر
پہنچی جو آسماں تلک شہرت تو کیا ہوا

مشہور ہے نکلتے ہیں دولت سے کام سب
قاروں کی دسترس میں تھی دولت تو کیا ہوا!

بدنامیاں اور عشق تو چلتے ہیں ساتھ ساتھ
رسوا ہوئی جو شہر میں عزت تو کیا ہوا

ہم تو کھڑے ہیں چاک گریباں لیے ہوئے
اس کو نہیں ہے دید کی فرصت تو کیا ہوا!

سب ولولے تو دل کے ہوئے رزقِ انتظار
اب مل گئی جو ان کی اجازت تو کیا ہوا!

بازدید

نہ یُوں دُزدیدہ سے مجُھے تم دیکھتے جاؤ
مرے دل کو نہیں ہے تاب ان قاتل نگاہوں کی،
میں مرنے سے نہیں ڈرتا
مگر یہ خُوش نما آنکھیں
مجُھے بے موت ماریں گی
کہ ان کی بات کا رشتہ سمجھ میں کچُھ نہیں آتا
مرے دِل کو نہیں معلُوم مطلب اُن اشاروں کا

نہ یُوں لرزیدہ پلکوں سے مجُھے تم دیکھتے جاؤ
نہ یُوں دُزدیدہ نظروں سے مجُھے تم دیکھتے جاؤ

○

زمانہ خود بتا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا
سبھی پردے اُٹھا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا

وہ افسانہ جسے تم سرسری سی داستاں سمجھے،
تمھیں اک دن رُلا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا

وہی جو اس زمانے کا مسیحا تم کو کہتا ہے
یہی قاتل بنا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا

دِنوں کے آنے جانے ہیں تمھاری ہی طرح مجھ کو
زمانہ بھی بھلا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا

سنایا ہے مجھے جو آج تم نے، کل یہی قصّہ
تمھیں موسم سنا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا

بہت آباد رستوں سے گزرتا وقت کا دریا
سبھی نقشے مٹا دے گا ہیں تم سے کچھ نہیں کہتا

اپنا گھر

زندگی کے رستوں میں اتنی گرد اُڑتی ہے
فاصلے سے دیکھیں تو کچھ نظر نہیں آتا
منزلوں کے چہرے بھی، راہ کی نشانی بھی
سب ہی ڈوب جاتے ہیں
گرد کے سمندر میں ــــ درد کے سمندر میں
راستہ نہیں ملتا، فاصلہ نہیں گھٹتا۔

جس جگہ سے نکلے تھے ہم سفر کے رستوں پر
واں پہنچ کے دیکھیں تو ہر طرف اُداسی ہے
ہر طرف اندھیرا ہے
کچھ نظر نہیں آتا ــــ!
بے نشان رستوں میں
واہمے تو آتے ہیں
اپنا گھر نہیں آتا۔

ملاپ

اِک دُوجے میں اُلجھ گئے ہیں تیرے میرے ہاتھ
چلتی جائے ساتھ ہمارے رنگوں کی بارات
رستہ رستہ دمک رہا ہے تاروں کا اِک کھیت
چمک رہی ہے پاؤں کے نیچے خُنک سُنہری ریت
چاروں جانب لپک رہی ہے ایک سُریلی تان
تان بھی ایسی جس کی رَو میں کھنچتی جائے جان
چاند اور سُورج سرگوشی میں باتیں کرتے جائیں
اِک بے نام سے بھیدوں میں تارے اُڑتے جائیں
پھیل رہی ہے لمحہ لمحہ بھید بھری یہ رات
اِک دُوجے میں اُلجھ گئے ہیں تیرے میرے ہاتھ

○

یاد اِک بھُولی داستاں کریں
اِس زمیں کو ہی آسماں کریں

دفن کر کے پُرانی یادوں کو
آرزوؤں کو پھر جواں کریں

زندگی سے گریز کا وقفہ
تم اِشارہ کرو جہاں، کریں

جان سے جائیں اور پھر تم کو
ایسی صُورت ہو اپنی جاں کریں

دل سے رخصت کریں ہر اک خواہش
اور پھر تم کو مہماں کریں

عشق کی آگ میں جلا کر دل
راستوں کو دُھواں دُھواں کریں

دیکھ کر پھر تمہاری آنکھوں میں
ہر حقیقت کو اک گماں کریں

ہمارا شہر

ہمارے شہر کو دیکھو
اِسے وہ لوگ بھاتے ہیں
جو اِس کی آبرو کو چوک میں نیلام کرتے ہیں
جو اِس کے قتل کی سازش میں سرتاپا ملوّث ہیں
اِسے برباد کرنے کی صلائے عام کرتے ہیں

ہمارے شہر کو دیکھو
اِسے ڈھلتا ہُوا سُورج بہت محبوب لگتا ہے
زوالِ دم بدم اس کو نہایت خُوب لگتا ہے

یہ اپنا آپ دُشمن ہے ہمیں بُزدل بناتا ہے
میں اپنے شہر کو دیکھوں تو مُجھ کو خوف آتا ہے!

○

دل مجھے دیکھے چلا جاتا تھا میں دِل کی طرف
راستے بند تھے سب کوچۂ قاتل کی طرف

غم کے صحرا نے کچھ اِس طرح رکھا تھا مصروف
پاؤں اُٹھتے ہی نہ تھے وادیٔ منزل کی طرف

چاند کے حُسنِ جہاں سوز کو تکنے والے
اِک نظر دیکھتے تاروں کی بھی جِھلمِل کی طرف

رُوئے لیلیٰ کا جمال آنکھ سے اوجھل ہی رہا
دیکھتی رہ گئی دُنیا ترے محمل کی طرف

چاند ہی تجھ کو نہیں ڈھونڈ رہے تھا بادل بادل
تھیں ستاروں کی بھی آنکھیں تری محفل کی طرف

سب کی آنکھوں میں تھی رقصاں ترے خنجر کی لپک
دیکھتا کوئی نہیں تھا دلِ بسمل کی طرف

ہم تری دید کے بھُوکے ہیں تجھے چاہتے ہیں
ڈُوبنے جائیں تو جائیں ترے ساحل کی طرف

○

دل کے آنگن میں اُتر آئی ہیں کرنیں کیا کیا
رنگ میں ڈوب رہی ہیں مری پلکیں کیا کیا

جب سرِ شام، سرِ بام نکل آئے وہ
گھیرتی ہیں دلِ برباد کو سوچیں کیا کیا

کیا کیا ایک اچٹتی سی نظر نے اُس کی
خواہشیں پھوٹ رہی ہیں مرے دل میں کیا کیا

اے مری راہ سے مُنہ پھیر کے جانے والے
راستہ دیکھ رہی ہیں ترا آنکھیں کیا کیا

چاند جب ہجر کی شب چھت پہ نکل آتا ہے
تنگ کرتی ہیں دلِ زار کو یادیں کیا کیا

○

(نذرِ میر)

ذات کی آگہی جو پاتا ہے
وہ بڑی خوش رُوی سے جاتا ہے

بے وفا، سوچ تو ذرا دِل میں
ایسی تعمیر کون ڈھاتا ہے!

یہ ترا غم ہے یا غمِ دُنیا
کوئی تو ہے جو کھائے جاتا ہے

ایک ٹہنی کے پھول ہیں دونوں
موت اور زندگی میں ناتا ہے

ایسے آتا ہے وہ مرے دل میں
جیسے کوئی خیال آتا ہے

خوب سجتا ہے اُس کو ہر کپڑا
ہر کوئی رنگ اُس کو بھاتا ہے

یہ جہاں ہے، نہیں گلی اُس کی
"تو کہاں مُنہ اُٹھائے جاتا ہے"

دل دَرد کا دروازہ

دل درد کا دروازہ
ہر آن ہیں دے دستک احساس کوئی تازہ
دل درد کا دروازہ

ہر وقت نئی گھاتیں ہر لمحہ نئی باتیں
آزاد ہُوئے پنچھی ، آباد ہوئیں راتیں
اس دشت کی وسعت کا کیا کیجیے اندازہ

آواز کا گُل دستہ آباد ہُوا رستہ
ہے شام کے ہاتھوں میں اِک بھید بھرا بستہ
یہ عُمر کا رونا ہے اِک خواب کا خمیازہ
دل درد کا دروازہ

تیرا خیال

پھیلتی جا رہی ہے خوشبو سی
دل میں کس کا خیال آیا ہے

تُو اثاثہ ہے میرے جیون کا
بڑی مشکل سے تجھ کو پایا ہے

مجھ سے ہرگز جدا نہیں ہونا
وقت کی بھیڑ میں نہیں کھونا۔!

خواہش کی حد

خواہشوں کا سِرا نہیں کوئی
یہ سدا بے کنار ہوتی ہیں
خواہشیں، وقت کے سمندر میں
آپ اپنا شکار ہوتی ہیں

تم اگر راستے میں مل جاؤ
زندگی کا سفر سپھل ہو جائے
مسئلہ خواہشوں کا حل ہو جائے!

ایک شعر

ترے جمال سے آنکھیں حسین ہیں میری
ترے خیال سے دل میں چراغ جلتے ہیں

قطعات

زندگی میں چین کا لمحہ کوئی آیا نہیں
میں نے تم کو کھو دیا تم نے مجھے پایا نہیں
حُسن کا جلوہ ہو تم خُوشبو تمُھارا نام ہے
کانچ کا پیکر ہُوں میں میرا کوئی سایا نہیں

جو بات دل میں نہفتہ ہے اُس کی تُو جانے
مِرے گمان کا رُستہ تری زباں تک ہے
تمام رنگ ہیں قوسِ قزح کے کھُلنے تک
تمام کھیل محبّت کے امتحاں تک ہے!

اب کون ہمیں دیکھے

اب کون ہمیں دیکھے
ہم لوگ کہ رستوں کی مٹّی میں ہُوئے مٹّی!
اشکوں سے بھری آنکھیں دیکھیں تو کہاں دیکھیں،
اب درد کے صحرا سے آواز نہیں آتی
رازوں سے بھرا رستہ خاموش ہے صدیوں سے
ہر سمت اُداسی ہے ہر سمت ہے ویرانی
عُمروں کی پریشانی
اس خاک پہ رکھی ہے وہ چاند سی پیشانی

جس کی تب و تابش نے صدیوں کو کیا روشن
وہ ہاتھ ہیں بے مایہ
تھیں جن کی قلم رو میں قرنوں کی جہانگیری
وہ پاؤں نہیں اُٹھتے
تھا جن کے تسلّط میں امکان کا ہر رستہ!
ہم لوگ کہ رستوں کی مٹّی میں ہُوئے مٹّی
اب کون ہمیں دیکھے!

حرفِ راز

جہاں میں پھرتا ہُوں میں ایک حرفِ راز لیے
مغنّی جیسے کوئی ناشنیدہ ساز لیے
مرے گلُو میں ہیں پوشیدہ اب بھی راگ کئی
کہ جن کا سوز و غنا
تمُھارے شہر کے پتّھر دلوں کو دھڑکا دے
وہ چند لوگ جو کن رس ہیں اُن کو گرما دے!

○

جب کبھی تری یاد آتی ہے
روشنی راستہ دکھاتی ہے

آنکھ میں پھیلتی ہے انگڑائی
دل میں کچھ چیز ٹوٹ جاتی ہے

دن ہو جیسا گزر ہی جاتا ہے
رات کیسی ہو کٹ ہی جاتی ہے

موت ہی زندگی کی دشمن ہے
موت ہی زندگی بچاتی ہے

حُسن کے دَم سے ہے یہ سب رونق
عشق دُولھا ہے دِل براتی ہے

دیکھ لیتے ہیں جب تری صُورت
جان میں پھر سے جان آتی ہے

دل کو کھاتا ہے اِس طرح ترا غم
آگ لکڑی کو جیسے کھاتی ہے

پھر کِسی یاد کی ہَوا امجد
دِل میں اِک آگ سی لگاتی ہے

○

جو دل میں بات باقی رہ گئی ہے
بس اِتنی رات باقی رہ گئی ہے

کھُلے اسرار سب ارض و سما کے
بس اپنی ذات باقی رہ گئی ہے

مبارک ہو تمھیں اے شب گزیدو
پھر بھر رات باقی رہ گئی ہے

سُنہری سی کرن اِک روشنی کی
سرِ ظُلمات باقی رہ گئی ہے

نہیں اِس کے لیے الفاظ کوئی
جو دل میں نعت باقی رہ گئی ہے

کہانی کہہ چُکے دُنیا جہاں کی
وُہی اِک بات باقی رہ گئی ہے

بتائے کون اِس ظُلمت سرا میں
کہ کتنی رات باقی رہ گئی ہے!

امجد اسلام امجد کی دیگر کتب

برزخ

ساتواں در

فشار

ذرا پھر سے کہنا

اس پار

اتنے خواب کہاں رکھوں گا

بارش کی آواز

سحر آثار

ساحلوں کی ہوا

ہم اس کے ہیں (مجموعہ غزل)

میرے بھی ہیں کچھ خواب (مجموعہ نظم)